اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام (ال عمرٰن: 19)

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ۔وَالْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

دین اسلام قانون فطرت ہے۔اس کے مطابق زندگی گزارنے سے دنیا میں روتے ہوئے آنے والا ہنستا ہوا واپس جنت کی طرف لوٹتا ہے۔ یہ انسان کو اللہ رب العزت کی رضا والی زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔

سلامتی کا علمبردار دین:

اسلام سے پہلے جتنے بھی ادیان آئے ،ان کے نام یا تو انبیائے کرام کے ناموں پر رکھے گئے یا قبیلوں کے نام پر یا جگہوں کے نام پر رکھے گئے۔ مثلاً:

عیسائیت کا نام مسیح کے نام پر رکھا گیا، مسیح اللہ، یعنی دین کے نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس سے کسی نبی علیہ السّلام کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

یہودیت کا نام، ایک قبیلہ جودہ کی نسبت سے ہے، جودہ ازم، وہاں سے جوگنا۔ یہودی بن گئے۔ گویا یہ لفظ بھی ایک قبیلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اسلام نہ تو کسی شخصیت کی طرف اشارہ کرتا ہےاور نہ ہی کسی قبیلے کی طرف۔ یہ لفظ ہی انوکھا ہے۔ یہ دین ، دینِ فطرت ہے۔ دینِ کامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی ایسا پسند کیا، جس نام سے اس کی تعلیمات کا پتہ چلتا ہے۔اسلام، تسلیم سے ہے۔

اَسْلِمْ تَسْلِمْ ''اسلام قبول کرلے،سلامتی پا جا''

انگلش میں اسے Peace کہتے ہیں۔اس کا معنی ہے ''امن'' تو اسلام دنیا میں سلامتی دینے کے لیے آیا ہے۔

☆صحت کی سلامتی

☆روحانیت کی سلامتی

☆اخلاق وکردار کی سلامتی

☆حقوق اللہ کی سلامتی

☆حقوق العباد کی سلامتی

حتی کہ اسلام نے ہر چیز کی سلامتی سکھائی ہے۔

جھگڑوں کے دروازے بند کرنے والا دین:

آپ غور کریں کہ باوجود اس کے کہ مال ودولت کی اللہ کے ہاں کوئی وقعت نہیں،قرآن مجید کی یہ آیات اتاری گئیں کہ اگر تم کسی کو قرض دو یا اس سے لو،تو

فَلْيَكْتُبْ بَيْنَهُمَا كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ() ''ایک لکھنے والا تمہارے درمیان ایک تحریر دے''

اس میں طلبا کے لیے ایک نکتہ ہے کہ جس مال ودولت کی اللہ کے ہاں کوئی وقعت نہیں تھی،اگر مومن کے اس مال کی حفاظت کی بھی اللہ تعالیٰ اتنی تاکید فرماتے ہیں کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے،کوئی تم سے لوٹ کر نہ لے جائے،کوئی تمہیں دھوکا نہ دے جائے،تو اس مومن کی روحانیت اور اخلاق کو بچانے کے لیے کتنی تعلیمات دی گئی ہوں گی۔یہ لکھنے کا حکم کیوں دیا گیا؟اس لیے کہ معاملات کرتے ہوئے لوگ آپس میں بھائی اور دوست بن کر اعتماد سے کام کرتے ہیں،لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جہاں بھی مال آتا ہے

وہاں انسان کے اندر شیطان کو آنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ یہ بھائی، بھائی کے درمیان تفریق ڈال دیتا ہے، اور بھائی، بہن کے درمیان تفریق ڈال دیتا ہے۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ

باپ کی جائیداد پر بھائی اور بہن کے درمیان جھگڑا

دو بھائیوں کے درمیان جھگڑا

ماں اور اولاد کے درمیان جھگڑا

شریعتِ مطہّرہ کا حسن دیکھیے کہ پہلے ہی جھگڑوں کے دروازے بند کر دیے۔ بھئی! تم لکھ لو، تاکہ تمہارا مال ضائع نہ ہو۔ جو پروردگار مال کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے تعلیمات ارشاد فرما رہے ہیں، وہ انسان کو ایمان کے ضائع ہونے کے بارے میں کیوں تعلیمات ارشاد نہیں فرمائیں گے۔ دین اسلام ایسا سلامتی کا دین ہے جس نے ہر ایک کے حقوق متعیّن کر دیے ہیں۔

شریعت میں قیل وقال کی گنجائش نہیں:

جب انسان کلمہ پڑھتا ہے تو ساتھ یہ بھی پڑھایا جاتا ہے:

وَ قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ ''اور میں نے اللہ کے تمام احکام کو قبول کر لیا۔''

جس طرح نکاح کے وقت خاوند کہتا ہے، قَبِلْتُ اور بیوی کو نکاح میں قبول کر لیتا ہے۔ پھر بیوی کی جتنی بھی ضروریات ہوتی ہیں ان کا پورا کرنا خود بخود خاوند کے ذمے ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح جس نے کلمہ پڑھا اور اس نے قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ کے الفاظ کہہ دیے، اس کے اوپر پوری شریعت کے احکام پر عمل کرنا لازم ہو گیا۔ اب ہمارے پاس یہ اختیار نہیں ہے کہ ہم پوچھیں کہ شریعت میں ایسا کیوں ہے؟ کیوں والی بات ہی نہ رہی۔ پتہ ہی کاٹ کر رکھ دیا۔ ہمارے پاس اختیار ہی نہیں۔ ہم سوال پوچھ ہی نہیں

سکتے کہ ایسا کیوں ہے، نہیں، بس! مالک کا حکم ہے جو ہم نے قبول کرلیا ہے اور اب فقط سر جھکانا ہے۔ ہاں! یہ تو پوچھ سکتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟ شریعت نے اس سوال کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

☆اپنے استاد سے پوچھیے

☆مفتی صاحب سے پوچھیے

☆والدین سے پوچھیے

☆بزرگوں سے پوچھیے

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ()''اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر (اہل علم) سے پوچھیے''

اسلام میں سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی:

بلکہ پوچھنے کو شریعت نے اچھا سمجھا ہے۔اس لیے حدیث پاک میں فرمایا:

شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ

یعنی جہالت یا نہ جاننا ایک بیماری ہے اور اس بیماری کا علاج سوال کے پوچھ لینے میں ہے۔گویا سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ سوال پوچھا کرو۔ساتھ یہ بھی کہہ دیا:

حُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ

''اچھا سوال پوچھنا آدھے علم کی نشانی ہے۔''

وہ تو آدھا علم ہوتا ہے۔بلکہ مومن کو سوال پوچھنے کی ترغیب دی گئی، حکم دیا گیا، فضائل سنائے گئے۔

حدیث پاک میں ہے کہ ’’جو سائل غربت کی وجہ سے روٹی مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے چند بندوں کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

☆جس بندے نے مال کمایا، اس کی مغفرت،

☆جس بندے نے اس کا کھانا بنایا، اس کی مغفرت اور

☆جس بندے نے وہ کھانا سائل تک پہنچایا، اس کی بھی مغفرت‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں کھانا دینے پر تین بندوں کی مغفرت ہوتی ہے۔لیکن جس طالب علم نے اپنے استاد سے دین کا سوال پوچھا، حدیث پاک میں آیا ہے کہ اس سوال کے پوچھنے پر اللہ تعالیٰ چار بندوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔

(۱) سوال پوچھنے والے کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔روٹی کے سوال والی حدیث پاک میں اس روٹی مانگنے والے کی مغفرت کا کوئی تذکرہ نہیں۔بھئی! اس نے روٹی طلب کی اور اس کو روٹی مل گئی، بات ختم۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔لیکن اس حدیث پاک میں فرمایا کہ جو بندہ دین کا سوال پوچھتا ہے، اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اس سائل کی مغفرت فرماتے ہیں۔

(۲) جو استاد اس سوال کا جواب دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس جواب دینے والے کی بھی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

(۳) جو آس پاس میں بیٹھے سوال و جواب کو سن رہے ہوتے ہیں، مجلس میں، کلاس روم میں، کمرہ جماعت میں، ان کی بھی اللہ تعالیٰ مغفرت فرما دیتے ہیں۔

(۴) ایک آدمی وہاں موجود نہیں تھا لیکن اس استاد اور طالب علم والے عمل سے محبّت کرتا تھا، ان پر وہ خرچ کرتا تھا، ان کی دل میں محبّت رکھتا تھا۔حدیث پاک میں آیا ہے کہ سوال پوچھنے والے اور جواب

دینے والے سے محبّت رکھنے والے بندے کی بھی اللہ تعالیٰ مغفرت فرما دیتے ہیں۔ بیٹھے گھر میں ہوتے ہیں اور ادھر مغفرت ہو رہی ہوتی ہے۔

سوال پوچھنے کی حدود و قیود:

دیکھو! دین کا سوال پوچھنے کا اللہ کے ہاں کتنا درجہ ہے۔ لیکن حدود و قیود بھی بتا دیے۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ()

''اے ایمان والو! تم ایسی باتیں مت پوچھو کہ جو کھل جائیں تو تمہارے لیے مشکل کا باعث بن جائیں۔''

لیکن پھر ان کے جواب کو تم پسند نہ کرو۔ مقصد کیا؟ کہ سوال برائے سوال نہیں ہونا چاہیے، سوال علم حاصل کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ مگر کچھ لوگ

☆ اعتراض کی نیت سے سوال کرتے ہیں

☆ اپنا آپ دکھانے کی نیت سے سوال کرتے ہیں

☆ لوگوں پر اپنی علمیت ظاہر کرنے کے لیے سوال کرتے ہیں۔

شریعت نے ان تمام چیزوں کا راستہ بند کر دیا ہے کیونکہ ایسے سوال بدنیتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ شریعت کا حسن دیکھو۔ حصولِ علم کے لیے سوال پوچھنا ہو تو اس کا حکم دیا گیا اور فضائل بتائے گئے۔ لیکن اگر دکھاوا آجائے، بدنیتی آجائے یا دوسروں کو نیچا دکھانا ہو تو ایسے سوال سے منع کر دیا۔ جس شریعت نے سوال پوچھنے اور جواب دینے والے کے احکام کو بھی اتنا کھول کر بتا دیا، اس شریعت نے زندگی کے باقی احکام کو کیسے کھولا ہوگا۔ واقعی دینِ اسلام سلامتی کا دین ہے۔ جس نے بھی اس کو قبول کیا وہ سلامتی پا گیا۔ دنیا

میں بھی آخرت میں بھی۔

دنیادارلوگ دھکے کھا کھا کے کچھ باتیں سیکھتے ہیں اور جب وہ علما سے پوچھتے ہیں تو شریعت میں اس کا حکم پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ دھکے کھا کھا کے سیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام آئندہ نہیں کرنا اور علما کہتے ہیں کہ شریعت نے تو اس سے پہلے ہی منع کر دیا تھا۔

اسلام میں دل توڑنے کی مذمت:

شریعت نے ہر بندے کو سلامتی دی اور ہر ایک کے حقوق متعیّن کر دیے۔ یہ ایسا سلامتی کا دین ہے، آپ حیران ہوں گے ..... کہ درخت کے اوپر پتہ لگا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بندہ پتے کو بے مقصد توڑتا ہے تو شریعت نے اس کو بھی مکروہ قرار دیا ہے کہ بے مقصد کیوں توڑا۔ جس شریعت نے پتے کو بے مقصد توڑنا مکروہ قرار دیا ہو تو پھر کسی انسان کا دل توڑنا، کیا قرار دیا ہوگا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم دین اسلام پر عمل کرنے والے بن جائیں تو ہم خود بھی سکھی رہیں گے اور اللہ کے بندوں کے لیے بھی راحت جان بن جائیں گے۔ چونکہ عمل میں کمی ہوتی ہے اس لیے اللہ کے بندوں کے لیے وبال جان بنے ہوتے ہیں۔ ہمارے شکل وصورت دیکھو، تو بڑی مومنوں والی اور اگر اہل خانہ سے ہمارا برتاؤ پوچھو تو اللہ توبہ کریں گے۔

☆ بچوں سے پوچھو تو کہیں گے، ابو جیسا نہیں بننا۔

☆ بیوی سے کہو کہ دین دار بن جاؤ، وہ کہتی ہے کہ جیسا دین دار میرا خاوند ہے، میری توبہ، میں ایسی دین دار نہیں بن سکتی۔

☆ حقیقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوتے ہیں:۔

☆ اپنی نالائقیوں کی وجہ سے

☆اپنی بے ضابطگیوں کی وجہ سے

☆معاملات اچھے نہیں ہوتے

☆اخلاق اچھے نہیں ہوتے

☆معاشرت اچھی نہیں ہوتی

اگر کوئی بندہ مصلے پر بیٹھ کر نماز پڑھ لے تو کیا وہ اچھا انسان بن گیا؟ ہرگز نہیں۔اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو اپنے تعلّق کو ٹھیک کیا مگر اللہ کے بندوں کے ساتھ بھی تو اپنے تعلّقات کو ٹھیک کرنا ہے نا۔ جب تک ان تعلّقات کو ٹھیک نہیں کرے گا، کامل نہیں بنے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کسی نے ایک آدمی کی تعریف کر دی۔انہوں نے پوچھا! بھئی! بتاؤ کہ تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کیا ہے؟ وہ کہنے لگا: حضرت میں نے لین دین تو کبھی نہیں کیا۔انہوں نے فرمایا: کہ اچھا یہ بتاؤ کہ اس کے ساتھ کبھی سفر کیا ہے؟ اس نے کہا: جی سفر بھی کبھی نہیں کیا۔ پھر حضرت نے فرمایا: اچھا! پھر تم نے اس کو مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا اس لیے تو اس کی اچھائی بیان کر رہا ہے۔تو معلوم ہوا کہ کسی کی اچھائی کی سند اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ معاملہ نہ کیا جائے۔اس کی عادات اور اخلاق کا پتہ ہی تب چلتا ہے جب لین دین کا معاملہ کیا جائے۔

شخصیت کی پہچان:

آدمی جہاں رہتا ہے، وہاں جو اس کے قریب ہوتے ہیں وہ اس کی شخصیت کے بارے میں بہترین رائے دیتے ہیں۔آج کل کے لوگ

بچوں سے پوچھتے ہیں

بیوی سے رائے پوچھتے ہیں

نوکر چاکر سے رائے پوچھتے ہیں

ساتھ رہنے والے ڈرائیور سے پوچھتے ہیں کہ بندہ کیسا ہے؟

پھر بندے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسا ہے۔

آپ اکثر دیکھیں گے کہ ساری دنیا بندے کو بڑا مانتی ہوگی۔لیکن اس کی بیوی، بچے اور کام کرنے والے خادم ناک تک ہوئے ہوں گے، اللہ توبہ کرتے ہوں گے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب سید الاولین و الآخرین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبےٰ ﷺ کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔آپ ﷺ کی نبوت پر سب سے پہلے وہ ایمان لائے جو سب سے زیادہ قریب تھے۔

دوستوں میں سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔حدیث پاک میں آتا ہے کہ زمانہ جاہلیت یا حالتِ اسلام میں کبھی آپ ﷺ سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ایسی دوستی تھی۔سب سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا۔

بیوی نے اسلام قبول کیا۔

زید رضی اللہ عنہ جو غلام تھے انہوں نے اسلام قبول کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر کے بچے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا۔

یعنی جو سب سے قریبی تھے، انہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔

اسلام مقناطیسیت کا نام:

مقناطیس قریب کی چیزوں کو جلدی کھینچتا ہے۔اسلام کی مثال مقناطیس کی مانند ہے۔جس شخص میں جتنا اسلام ہوگا۔اس میں اتنی ہی مقناطیسیت ہوگی۔آپ ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ ہم لوگوں کے پاس اسلام کا ظاہر ہے، باطن نہیں ہے اس ظاہر پر لوگ اتنی محبّتیں جتلاتے ہیں، اگر ہمارے پاس باطن ہوتا تو پھر محبّتوں کا کیا عالم ہوتا، گویا اسلام، نام ہی مقناطیسیت کا ہے۔

دو صحابہؓ کی ایک درخشندہ مثال:

دو صحابہ انڈونیشیا میں آئے۔ انہوں نے کوئی تبلیغ نہیں کی۔ کوئی وعظ نہیں کیا۔ کوئی درس قرآن نہیں دیا۔ فقط دکان کھولی۔ ان کی دکانداری کو دیکھ کر پورا ملک مسلمان ہو گیا۔ ایسے اصولوں کے ساتھ دکانداری کی کہ لوگ ان کی دکان سے خریداری کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر لوگ دیکھتے کہ یہ درمیان میں کچھ وقت کے لیے دکان بند کر دیتے ہیں۔ پوچھتے کہ گاہک کھڑے ہوتے ہیں اور آپ دکان بند کر دیتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ وہ کہتے کہ اس وقت میں ہم اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ پھر پوچھتے ہیں: جی! آپ چھٹی کیوں کرتے ہیں؟ بتاتے کہ وہ جمعہ کا دن ہوتا ہے۔ لوگوں نے کہا: اچھا! تمہیں دکانداری کے یہ اصول و ضوابط کس نے سکھائے؟ انہوں نے کہا: یہ اصول وضوابط ہمیں ہمارے نبی ﷺ نے سکھائے۔ وہ کہنے لگے کہ اگر انہوں نے آپ کو سکھائے تھے تو آپ ہمیں بھی سکھا کر اپنے جیسا بنا لیجیے۔ سبحان اللہ!

پتہ چلا کہ مسلمان کا فقط بیٹھ جانا ہی دعوت ہوتا ہے بشرطیکہ عمل بھی ہو۔ اگر شکل وصورت سے ہی یہود و نصاریٰ کی مشابہت ہو کہ ''جن کو دیکھ کر شرمائیں یہود۔'' ایسے مسلمان کا بیٹھنا اٹھنا ہرگز دعوت نہیں بن سکتا۔ مسلمان کہلانا آسان ہے لیکن مسلمان بن کے رہنا بڑا مشکل کام ہے۔ جو بنتا ہے یا بناتا ہے وہ پتہ پاتا ہے

چوں می گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را

''جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ اس لیے کہ میں لا الہ الا اللہ کی مشکلات کو سمجھتا ہوں''

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اسلام اور ایمان میں فرق:

چند اعرابی نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے پاس آئے۔ وہ کلمہ پڑھ کر کہنے لگے: ''ہم نے تو اسلام قبول کر لیا اور مومن بن گئے۔ گویا وہ احسان جتلانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے آیتیں اتار دیں۔ فرمایا:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ''یہ جانگلی، دیہاتی، اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے، البتہ تم یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا، اور ابھی ایمان کامل تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

یعنی ابھی تو ابتدا ہے۔ ذرا قدم آگے بڑھاؤ گے اور عمل کر کے دکھاؤ گے تو ایمانِ کامل پھر دل میں داخل ہوگا۔ پتہ چلا کہ لا الہ الا اللہ کہنے سے کام ختم نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو کام کی ابتدا ہے۔ اس کے بعد اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا۔

بندۂ مومن کی اتنی عظمت !!

یہ بات یاد کر لیجیے کہ مومن جہاں بھی ہوتا ہے وہ اللہ کے بندوں کے لیے راحتِ جان بنا ہوتا ہے۔ ایمان والوں کے سامنے نرم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو فرماتے ہیں:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ

''اے محبوب! ایمان والوں کے لیے اپنے کندھے جھکا دیجیے۔''

جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو بھی یہ حکم دے رہے ہیں تو پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں کہ اکڑفوں میں رہتے ہیں۔

انا کا مسئلہ:

ہم تو ذرا ذرا سی بات کو اپنے لیے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔

دو دوستوں کا تعلّق دیکھو تو انا کا مسئلہ

میاں بیوی کے معاملات کو دیکھو تو انا کا مسئلہ

رشتہ داروں کے تعلّقات کو دیکھو تو انا کا مسئلہ

ہمسایوں میں دیکھو تو انا کا مسئلہ

اس ''انا'' نے تو ہمیں ڈبو دیا ہے۔

ایک عجیب نکتہ:

علما نے ایک عجیب نکتہ لکھا ہے، ایک مرتبہ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ایک جہاد سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ تھک گئے، نیند آنے لگی، رات کا وقت بھی ہو گیا۔ چنانچہ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ سارا لشکر تھکا ہوا تھا اس لیے سب سونا چاہتے تھے۔ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے پوچھا: وہ کون ہے جو پہرہ دے اور ہمیں صبح فجر کی نماز کے لیے جگائے؟ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: اَنَا ''میں اس کام کے لیے حاضر ہوں'' چنانچہ ان کی ڈیوٹی لگ گئی اور باقی سب سو گئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھوڑی دیر تو چلتے پھرتے رہے۔ وہ بھی تھکے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی شان کہ ان کو کھڑے کھڑے نیند آ گئی۔ صبح کے وقت جب سورج طلوع ہوا اور سورج کی کرنوں نے نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے مبارک رخساروں کے بوسے لیے تو محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ عنہ کو جگایا اور فرمایا: بلال! آپ نے ہمیں جگایا ہی نہیں، فجر کی نماز

قضاء ہوگئی۔ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب ﷺ سے نماز قضا کروائی۔ کیوں؟ قضا نماز کا مسئلہ واضح فرمانا تھا۔ اگر نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی مبارک زندگی میں نماز کبھی قضا نہ ہوئی ہوتی تو امت کے سامنے قضاء نماز کا مسئلہ کیسے کھلتا؟ اگر نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کبھی نماز میں بھولتے ہی نہ تو سجدہ سہو کا مسئلہ کیسے واضح ہوتا؟ جی ہاں! ایک مرتبہ آپ ﷺ نے چار رکعت کے بجائے دو رکعت پر ہی سلام پھیر دیا۔ صحابہ ا نے کہا:

اَقُصِرَتِ الصَّلٰوۃِ اَمْ نَسِیْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!

اے اللہ کے نبی! کیا آج کے بعد یہ نماز کم ہوگئی یا آپ بھول ہوگئی؟

فرمایا:

لَا نَسِیْتُ بَلْ نُسِیْتُ

''میں بھولا نہیں، بلکہ بھلایا گیا ہوں''

اللہ تعالیٰ نے بھلا دیا ہے تا کہ تمہارے سامنے بھولنے کی صورت میں سجدہ سہو کا مسئلہ واضح ہو جائے کہ نماز کو کیسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔ اب سوچیے کہ جس محبوب ﷺ کا بھولنا بھی امت کے لیے رحمت ہوگا، اس محبوب ﷺ کا ہوش مندی کا معاملہ امت کے لیے کتنی بڑی رحمت ہوگا۔ جس محبوب ﷺ کا سو جانا امت کے لیے رحمت ہوگا اس محبوب ﷺ کا جاگنا امت کے لیے کتنی بڑی رحمت ہوگا۔ تو محبوب ﷺ سو گئے اور امت کے لیے قضا نماز کا مسئلہ واضح ہو گیا۔ چنانچہ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے بتایا کہ اب نماز قضا ہو گئی ہے۔

یہاں پر علما فرماتے ہیں کہ جب اللہ کے محبوب ﷺ نے پوچھا: بلال! تم نے ہمیں کیوں نہیں جگایا تو بلال

رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جواب دے دیا: اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ! جس اللہ نے آپ کو سلایا اسی اللہ نے مجھ پر بھی نیند طاری کر کے مجھے بھی سلا دیا..... بات تو آئی گئی ہوگئی .....لیکن یہاں محدثین نے نکتہ یہ لکھا کہ جب نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے پوچھا تھا کہ ہمیں کون جگائے گا تو بلال رضی اللہ عنہ نے جواب میں ''انا'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس ''انا'' کے لفظ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے نماز قضا کر کے دکھا دی۔ یہ انا یعنی ''میں'' بہت خراب کرتی ہے۔ یہ لفظ ہی اللہ کو پسند نہیں آیا۔

اس لیے ہمارے مشائخ ''میں'' کا لفظ استعمال ہی نہیں کرتے ۔ وہ فقیر کا لفظ اور عاجز کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ عاجز نے یہ کیا، فقیر نے یہ کیا، عاجز یہ کرنا چاہتا ہے۔ ''میں'' کا لفظ ہی زبان پر نہ آئے۔ اس لیے کہ یہ میں اللہ کو بہت ہی ناپسند ہے۔

ایک اور نکتہ:

بکری کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ بولتی ہے تو ''میں میں'' کرتی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے اسے اس کی ''میں میں'' کا کیا مزا چکھایا۔

سب سے پہلے اس کے گلے پر تیز چھری چلوائی اور خون کے فوارے چھوٹے۔ اس کی میں نکل رہی ہے۔

گردن کٹی

اس کی چمڑی اتروائی

جب چمڑی اتر گئی تو اس کے گوشت کی بوٹیاں بنوائیں۔

اس کی ہڈیوں کو بھی کٹوا دیا

پھر اسے آگ کے اوپر چڑھا کے کباب بنوا دیے اور دسترخوان پر پہنچا دیے۔

ہم جیسے فقیروں کے بتیس دانتوں نے اس کو پیٹ میں پہنچا دیا۔

گوشت پیٹ میں چلا گیا، ہڈیاں جانوروں کے منہ میں چلی گئیں۔

کسی ہڈی کو کتے نے چچوڑا اور کسی کو کسی اور نے توڑا۔

باقی رہ گئیں آنتیں۔ان آنتوں کو لوگوں نے مشینوں میں استعمال کرنے کے لیے خشک کیا۔

پہلے وقتوں میں روئی دھننے کی ایک مشین ہوتی تھی اس میں دھاگے کی جگہ بکری کی آنت خشک کر کے استعمال ہوتی تھی۔ دھاگہ ٹوٹ جاتا ہے اور یہ ٹوٹتی نہیں تھی۔ چنانچہ روئی دھننے کی مشین میں اس کو استعمال کرنے کے لیے اس کی آنتوں کو خشک کیا گیا۔ جب بالکل خشک ہو کر دھاگہ بن گئی تو کسی بندے نے اس کو اس مشین میں فٹ کیا۔ پھر جب وہ اس مشین کو چلاتے وقت دھاگے کو ہلاتا ہے تو اس میں سے ''توں توں'' کا لفظ نکلتا ہے۔

اس پر بزرگوں نے فرمایا: دیکھو! بکری کی میں اللہ کو اتنی ناپسند آئی کہ اتنے مراحل سے اسے گزارا، جب تک توں کا لفظ نہیں نکلا اس وقت تک نہیں چھوڑا۔

بھئی! ہم بھی اسی طرح بجائے اس کے کہ فرشتوں سے عذاب سہیں، مشقتیں اٹھائیں، سزائیں پائیں، بہتر یہ ہے کہ خود ہی توں کہنا شروع کر دیں۔تو میں سے بچیں اور توں کا سبق یاد کریں۔ ہماری خانقاہوں میں سب سے پہلے یہی بات سکھائی جاتی ہے۔

موبائل یونیورسٹیاں:

خانقاہ کس کو کہتے ہیں؟ کیا کسی عمارت کا نام ہوتا ہے؟ نہیں۔ خانقاہ شخصیتوں کا نام ہوتا ہے۔اب کوئی بندہ جس کو اللہ کے کسی بندے نے بنایا سنوارا اور اس کے سر پر بوجھ ڈالا کہ اب آگے لوگوں کو بناؤ۔ بننے کی پہچان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ آگے بنا رہا ہوتا ہے۔.....ایک دفعہ ایک بزرگ نے اپنے شاگردوں سے پوچھا: یہ بتاؤ کہ ذکر و سلوک میں لگا ہوا کون ہے؟ کسی نے کچھ جواب دیا اور کسی نے کچھ۔ایک شاگرد

نے عرض کیا: حضرت! آپ ہی بتا دیں۔ فرمانے لگے: ''ذکر وسلوک میں لگا ہوا وہ ہے جس کو لگی ہوئی ہو۔'' پھر پوچھا: بتاؤ! لگی ہوئی کس کو ہے؟ شاگردوں نے کہا: حضرت! اب اس کا جواب بھی آپ ہی بتا دیں۔ فرمایا: لگی ہوئی اس کو ہوتی ہے جو آگے لگا رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری سی چیز ہے.....تو خانقاہ کسی عمارت کا نام نہیں ہوتا، شخصیت کا نام ہوتا ہے۔

وہ عمارت کے نیچے بیٹھیں تو وہ خانقاہ

وہ درخت کے نیچے بیٹھ جائیں تو وہ خانقاہ

وہ چٹیل میدان میں بیٹھ جائیں تو وہ خانقاہ

وہ جنگل میں بیٹھ جائیں تو وہ خانقاہ بن جائے گی، بلکہ منگل کا سماں ہوگا۔

آج کے دور میں لوگ یونیورسٹیوں میں علوم سیکھنے جاتے ہیں۔ یہ خانقاہیں بھی موبائل یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک فون گھر میں ہوتا ہے اور ایک موبائل فون بھی ہوتا۔ موبائل فون پر جب چاہو اور جہاں چاہو، بات کرلو.....خانقاہیں موبائل یونیورسٹیاں ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں طلبا آٹھ گھنٹے پڑھتے ہیں اور ان موبائل یونیورسٹیوں میں وقت گزارنے والا چوبیس گھنٹے کا طالب علم ہوتا ہے۔ جب بھی شیخ کے پاس بیٹھا ہوتا ہے وہ سیکھ رہا ہوتا ہے۔ دن میں بھی رات میں بھی، سونا بھی سیکھتا ہے جاگنا بھی سیکھتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں تو صرف ایک مضمون پڑھا دیا جاتا ہے۔ الیکٹریکل پڑھنے والوں کو الیکٹرسٹی کے بارے میں مکینیکل والوں کو مکینیکس کے بارے میں۔ لیکن ان خانقاہوں میں آنے والے طالب علم کا جو سلیبس (نصاب) ہے وہ پوری زندگی سے متعلّقہ علوم ہیں۔ چنانچہ مشائخ چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز بھی سکھاتے ہیں۔

رسولِ اعظم ﷺ مرشدِ اعظم:

اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ ''مرشدِ اعظم'' تھے۔انہوں نے

تھوک پھینکنا بھی سکھایا

روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالنا سکھایا

پلیٹ سے سالن لقمے کے ساتھ کیسے لینا ہے، یہ بھی سکھایا۔فرمایا:

كُلْ بِيَمِيْنِكَ وَ كُلْ مِمَّ يَلِيْقُ

''دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور جو قریب کی جگہ ہے وہاں سے کھاؤ۔''

لقمہ چبا چبا کر باریک کرنا اور پھر نگلنا سکھایا۔

اپنی قضائے حاجت کے لیے کیسے بیٹھنا ہے، کس طرف رخ کرنا ہے، اور کس طرف نہیں کرنا، یہ بھی سکھایا۔

میاں بیوی آپس میں وقت کیسے گزاریں، یہ بھی سکھایا۔

ایک دوسرے کے ساتھ معاملات کیسے کرنے ہیں، یہ بھی سکھایا۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کیسے کرنی ہے، یہ بھی سکھایا۔زبانی ہی نہیں، بلکہ پریکٹیکل بھی کروایا۔یونیورسٹیوں میں جیسے پہلے تھیوری پڑھا دیتے ہیں اور پھر پریکٹیکل کرواتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ نے تھیوری بھی بتائی اور پریکٹیکل بھی کروایا۔نماز کی تعلیم زبان مبارک سے بھی دی اور پھر منبر پر چڑھ کر فرمایا:

صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِىْ اُصَلِّىْ

''جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو ویسے نماز پڑھو۔''

گویا پریکٹکل بھی کروایا۔

جیسا گمان ویسا فیض:

خانقاہ کے اندر رہتے ہوئے ہر چیز پر شیخ کی نظر ہوتی ہے۔کئی دفعہ قریب رہنے والے لوگ سوچتے ہیں کہ جی! شیخ کو پتہ ہی نہیں ہے۔ بیوی نے کوئی بات کی۔کہتا ہے: نہیں نہیں، خط میں اپنی بات ذرا ایسے ایسے لکھ دے، حضرت کو کون سا پتہ چلتا ہے۔کئی دوستوں کا یہ گمان ہوتا ہے۔او جی! باقی لوگ بھی تو اپنے اچھے اچھے حالات آ کر بیان کرتے ہیں۔ وہ کون سا جا کر دیکھتے ہیں، تم بھی اپنے اچھے اچھے حالات بیان کرو۔شیخ کے بارے میں ان کا یہ گمان ہوتا ہے۔ان کو اتنا اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہنے والے کی بات بھی سن رہے ہوتے ہیں اور کچھ اس کے دل کی حالت کو بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ذرا سوچیں کہ جب شیخ کے بارے میں گمان ہی یہ ہو کہ ان کو جیسے بھی حالات بتا دیں ویسے ہی وہ بات مان لیتے ہیں تو پھر بندے کو کیا فائدہ ہوگا۔پھر کہتے ہیں:

حضرت! میرے حالات اچھے نہیں ہیں

حضرت! میرا کاروبار ڈاؤن جا رہا ہے۔

حضرت! میری باطنی حالت بہت خراب ہوگئی ہے

حضرت! میں گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہوں

حضرت! نمازوں میں میرا دل نہیں لگتا

حضرت! تہجّد میں دل نہیں لگتا

جیسا آپ کا گمان ہوگا ویسا آپ کو فیض ملے گا۔

خود ہی مریض خود ہی طبیب:

مشائخ کی عادت ہوتی ہے خاموشی اختیار کرنے کی۔.....یہی عادت مبارکہ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی تھی، کئی معاملات میں جب ناپسند چیز سامنے آتی تھی تو آپ ﷺ خاموشی اختیار فرما لیتے تھے۔اور آپ ﷺ کی خاموشی میں یہ پیغام ہوتا تھا کہ یہ چیز اچھی نہیں ہے۔جیسے ایک صحابیؓ نے ایک اونچا مکان بنایا۔ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام خاموش ہو گئے۔کچھ بھی نہ کہا۔اور محبوب ﷺ کی خاموشی سے ہی ان کو میسج مل گیا شیخ مرید کی بات سن کر خاموشی کیوں اختیار کرتے ہیں؟

اس لیے کہ انہیں مریض کے مرض کا پتہ ہوتا ہے۔

آج کل تو مریض خود ڈاکٹر بن کر آتے ہیں۔کہتے ہیں:

''حضرت! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ مجھے یہ مشورہ دیں۔''

ایک صاحب نے آکر اپنے حالات بتائے اور حالات بتانے کے بعد ان کا حل بھی بتایا۔وہ دراصل عاجز کی زبان سے کہلوانا چاہتے تھے۔میں نے پوچھا: کیا آپ میری زبان سے کہلوانا چاہتے ہیں۔کہنے لگا: ہاں ہاں! بس میں اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کی زبان سے یہ جواب نکل جائے اور میں سن لوں۔اب بتائیں کہ جب خود ہی مریض ہوں اور خود ہی طبیب ہوں تو کیا بہترین علاج ہوگا!

تعلیماتِ اسلامی کا نکتہ کمال:

یہ دینِ اسلام کا حسن ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کو وہ تمام احکام سکھلا دیے جن کی ان کو ضرورت پڑتی ہے۔تمام اصول وضوابط بتا دیے۔لہٰذا اگر کوئی آدمی تھرڈ ورڈ میں زندگی گزارے تو بھی اسلام کی تعلیمات اس کے لیے موجود ہیں اور اگر کوئی بڑی ترقی یافتہ دنیا میں جا کر زندگی گزارے تو بھی اسلام کی تعلیمات سامنے ہیں۔قیامت تک کے لیے یہ شریعت ہمارے لیے کافی، وافی اور شافی ہے۔اس کی

تعلیمات ہی ایسی ہیں۔

رویتِ ہلال اور اسلامی تعلیمات:

نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے رمضان المبارک کے چاند کے بارے میں فرمایا:

صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَ اَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ

''چاند دیکھ کر تم روزے رکھو اور چاند دیکھ کر تم افطار کرو''

اس وقت یورپ میں مسلمانوں کے دو طرح کے گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو کہتا ہے کہ اتنی سائنسی ترقی ہو چکی ہے کہ انسان سائنس کے ذریعے چاند پر پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا یہ تو پہلے ہی سے پتہ ہوتا ہے کہ چاند کہاں نظر آئے گا اور کہاں نظر نہیں آئے گا۔ تو چاند کو دیکھ کر روزے رکھنے کا کیا مطلب؟ پہلے سے ہی اعلان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک ملک کی ایمبیسی کی طرف سے شعبان کے آخری جمعہ میں اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں دن روزہ ہوگا، صرف یہی نہیں، بلکہ یہ بھی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں دن عید ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جب سائنسی ترقی اتنی ہو چکی ہے کہ ہمیں پتہ ہے کہ چاند کس جگہ پر کب نظر آئے گا، اور کب نظر نہیں آئے گا۔ لہٰذا ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ہم جیسے لوگ وہاں رہ کر بھی چاند دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ہمیں ''پرانے دماغوں کے مولوی'' کہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: جی! روزے تو ہمارے ہیں، آپ کے تو ہیں نہیں۔ اس لیے ہم اپنا روزہ چاند کو دیکھ کر رکھیں گے۔ اور دیکھ کر کھولیں گے۔ الحمدللہ! ان ملکوں میں رہنے والے وہ لوگ جو اپنے اکابر کی طرز پر چلتے ہیں، وہ معلومات تو حاصل کر لیتے ہیں کہ کہاں چاند نظر آ سکتا ہے اور کہاں نظر نہیں آ سکتا، لیکن تصدیق کے لیے لوگوں کو اونچی عمارتوں پر بھیجتے ہیں، اور جب تک تصدیق نہیں ہو جاتی اور شرعی

گواہیاں نہیں مل جاتیں اس وقت تک روزے رکھنے کا اور افطار کرنے کا فیصلہ نہیں کرتے۔ یہ دوسرے گروہ کے لوگ ہیں۔

ایک دفعہ ایک صاحب ہمارے پاس آ گئے اور کہنے لگے: جی! آپ تو سائنس پڑھے ہوئے ہیں، انجینئر ہیں۔ آپ بھی ان پڑھوں والی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا: کیا مطلب؟ کہنے لگے: آپ تو سائنس جانتے ہیں اور آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم چاند دیکھ کر روزہ رکھیں گے اور چاند دیکھ روزہ کھولیں گے۔ یعنی عید منائیں گے۔ کئی دفعہ آسمان پر بادل بھی ہوتے ہیں، کبھی نظر نہیں بھی آتا، اس لیے سائنس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

خیر! ہم نے اس بندے کو تو جو جواب دینا تھا وہ اسے دیا۔ لیکن پھر ہم نے اس کے بعد اس کی تحقیق شروع کر دی کہ سائنس اس کے بارے میں کیا کہتی ہے۔

امریکہ میں سپیس (خلا) کے بارے میں ایک میوزیم ہے۔ وہاں پر ہر وقت بتایا جاتا ہے کہ خلا میں کیا ہو رہا ہے۔ ایک ریڈیو سٹیشن ہی ایسا ہے کہ آپ وہاں فون کریں تو آپ کو ہر وقت وہاں پر یہ خبریں سنائی دے رہی ہوں گی کہ اب

مشتری میں یہ ہو رہا ہے۔

عطارد میں یہ ہو رہا ہے۔

سورج میں یہ ہو رہا ہے۔

چاند میں یہ ہو رہا ہے۔

جو کچھ اوپر کی دنیا میں ہو رہا ہوتا ہے اس کے بارے میں معلومات بتائی جاتی ہیں۔ آج چاند کس کس جگہ پر نظر آئے گا اور کس کس جگہ پر نظر نہیں آئے گا، وہ بتاتے ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا: آج چاند کہاں

کہاں نظر آئے گا؟ انہوں نے کہا: فلاں فلاں جگہ پر نظر آئے گا۔ ہم نے پوچھا: آپ کی یہ بات پکی ہے یا اندازے پر مبنی ہے؟ جب ہم نے بات کو ذرا کھولنا چاہا تو وہ کہنے لگے کہ ہم سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ ہم نے پھر پوچھا: جناب! سو فیصد یقین کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے۔ انہوں نے کہا: جی! آپ نیوی والوں سے رابطہ کریں۔ ان کا مستقل ایک ڈیپارٹمنٹ ہے اور ایک بڑا کمپیوٹر ہے ان کے پاس۔ وہ چاند کے مدار کے ایک ایک انچ کی پیائش رکھتے ہیں، ان کو پکا پتہ ہوتا ہے۔ کہ اس وقت چاند کہاں پہ ہے۔ ان سے نمبر لے کر میں نے خود فون کیا۔ وہاں اس کمپیوٹرڈ یپارٹمنٹ میں ایک خاتون تھی۔ اس سے میری بات ہوئی۔ میں نے کہا: میں فلاں علاقے میں ہوں اور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں چاند نظر آئے گا یا نہیں نظر آئے گا۔ اس نے کمپیوٹر سے پتہ کر کے بتایا کہ صرف اتنے پرسنٹ چانس ہیں۔ میں نے کہا: واہ! انسان تو چاند پر قدم ٹکا چکا ہے اور سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ صرف اتنے پرسنٹ چانس ہیں نظر آنے کے، کوئی پکی بات کرو..... جو سوال دوسرے لوگ ہم سے کہتے تھے ہم نے ہو بہو وہی سوال ان سے کر دیا کہ کوئی پکی بات بتاؤ۔ انسان تو چاند پر پہنچ چکا ہے اور ابھی بھی آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ چانسز ہیں۔..... جب اس عاجز نے کہا کہ کوئی پکی بات بتاؤ کہ چاند یقینی طور پر نظر آئے گا یا نہیں آئے گا۔ تو اس نے کہا کہ ہم یقین سے کبھی بھی نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا: چاند پر چڑھ گئے اور یقین سے کہہ نہیں سکتے!؟ کہنے لگی: دراصل بات یہ ہے کہ اس کے درمیان کچھ مشکلات ہیں۔ وہ مشکلات یہ ہیں کہ ہم جو چاند کی پوزیشن بتاتے ہیں، وہ دیکھ کر نہیں بتاتے، حساب کی کچھ Equations مساواتیں ہیں۔ ہم ان سے جمع تفریق کر کے بتاتے ہیں کہ اب چاند یہاں ہوگا۔ وہ جمع تفریق کا حساب اتنا پکا ہے کہ صحیح پوزیشن کا پتہ چلتا ہے۔ اس کو Methematical Simulator کہتے ہیں۔ میں نے کہا: جب آپ کے پاس ایسی مساواتیں ہیں جو پکا حساب بتا دیتی ہیں تو آپ بھی پکی بات

کریں۔ کہنے لگی: جی! بات یہ ہے کہ ان مساواتوں میں چھ ہزار پیرامیٹرز ایسے ہیں جو Variables (متغیّرات) ہیں، ان میں سے کسی ایک کے بدلنے سے بھی رزلٹ بدل سکتا ہے۔

میں نے پوچھا: آپ کا یہ بتانے کا مقصد کیا ہے؟ کہنے لگی: دنیا کا کوئی انسان کبھی بھی گارنٹی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا چاہے کتنا بڑا سائنس دان ہو، کہ آج چاند کہاں اور کس جگہ پر ہوگا۔ اس میں شبے کی ہی گنجائش ہوگی، معلوم نہیں کہ ان چھ ہزار میں سے کوئی ایک پیرامیٹر بدل جائے اور چاند کی پوزیشن میں فرق آجائے۔

میں نے اس کی بات سن کر کہا: الحمدللہ! صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ اللہ کے محبوب ﷺ نے سچ فرمایا:

صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ

''چاند دیکھ کر روزہ رکھ لو اور چاند کو دیکھو تو افطار کر لو۔''

دنیا نے ٹھوکریں کھائیں، ریسرچ کی، سائنس کے پیچھے لگے رہے۔ بیسیوں سالوں کی محنت کے بعد بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ بھئی! یہ تو اب یہ بات کر رہے ہیں اور ہمارے محبوب ﷺ نے تو چودہ سو سال پہلے ہی یہ بتا دیا تھا۔

اس مثال سے آپ اچھی طرح سمجھ جائیں گے کہ انسان ٹھوکریں کھا کھا کے جو باتیں سمجھتا ہے، شریعت نے وہ باتیں ہمیں پہلے ہی بتا دی ہیں۔ اس لیے اپنے نئے تجربے کرنے کی ضرورت نہیں، مومن کو چاہیے کہ بس سر جھکائے اور اسلام کی تعلیمات پر قدم بڑھائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر ہر حکم ہماری سلامتی کا حکم ہے۔ اس میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی نقصان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہ سو فیصد پکی بات ہے۔

ایذائے مسلم سے اجتناب کی تعلیم:

نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے ارشاد فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَ يَدِهٖ

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامتی میں ہوں۔''

یہ دین اسلام میں مسلمان کی تعریف بتائی گئی ہے کہ مسلمان کون ہوتا ہے۔اس حدیث پاک میں کچھ طالب علمانہ نکات ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ یہاں سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ کیوں کہا؟ سَلِمَ النَّاسُ کیوں نہیں کہا؟ بھئی! سارے انسان ہی سلامتی میں ہونے چاہییں .....اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کو مسلمان معاشرے میں رہتے ہوئے اکثر و بیشتر مسلمانوں سے لین دین کا معاملہ کرنا ہوتا ہے۔جب مسلمانوں کے بارے میں کہہ دیا تو دوسرے لوگ بھی اسی ضمن میں خود بخود شامل ہوگئے۔ للا کثر حکم الکل ۔

اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ مُسْلِمُوْن کہا ہے، مُسْلِمَات کا صیغہ استعمال نہیں ہوا،تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب مردوں کی بات کر دی تو عورتیں خود بخود اس میں شامل ہیں۔

زبان اور ہاتھ کیوں کہا؟ اس لیے کہ تکلیف کا باعث عام طور پر یہی دو چیزیں ہی بنا کرتی ہیں۔قول سے اور فعل سے۔قول ہوتا ہے زبان سے اور فعل ہوتا ہے ہاتھوں سے۔

ہاتھ پر زبان کو مقدم کیوں کہا گیا؟ ہاتھ بڑا ہے،اور زبان چھوٹی ہے،اس لیے ہاتھ کو مقدم کرتے۔اگر عورت یہ حدیث پڑھے تو وہ کہے گی کہ مردوں کے ہاتھ بہت چلتے ہیں لہٰذا ہاتھ کو مقدم کرنا چاہیے،اگر مرد حدیث پڑھیں تو وہ کہیں گے کہ نہیں،عورتوں کی زبان بہت تیز چلتی ہے لہٰذا یہ بالکل ٹھیک ہے کہ

زبان کو مقدم کیا۔تو بھئی ! اب فیصلہ کون کرے کہ اس میں کیا حکمت ہے؟ اس میں کئی حکمتیں ہیں ۔

مثال کے طور پر:

انسان ہاتھوں سے جو ایذا پہنچاتا ہے وہ فقط ان لوگوں کو پہنچاتا ہے جو حاضر ہوتے ہیں ۔لیکن زبان سے ایذا اپنے گزرے ہوئے لوگوں کو بھی پہنچا سکتا ہے ۔حال کے لوگوں کو بھی اور آنے والی نسلوں کو بھی ایذا پہنچا سکتا ہے ۔اس لحاظ سے چونکہ زبان سے ایذا پہنچانے کا دائرہ کار ہاتھ سے بہت زیادہ ہے اس لیے نبی ﷺ نے اس کو مقدم فرمایا۔

ہاتھ سے لگا ہوا زخم مندمل ہو جاتا ہے جبکہ زبان سے لگا ہوا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا۔

کچھ تعلّقات ایسے ہوتے ہیں جن کو انسان ہاتھ سے نہیں کاٹ سکتا ، زبان ان تعلّقات کو بھی کاٹ کے رکھ دیتی ہے ۔اکثر آپ دیکھیں گے کہ جو انسان ہاتھ سے ایذا پہنچاتا ہے اس کی زبان بھی ضرور کچھ نہ کچھ بول رہی ہوتی ہے ۔مثلاً: آ میں تجھے دیکھتا ہوں ..... میں تجھے یہ کرتا ہوں ۔وہ کرتا ہوں اس لیے زبان کو ہاتھ پر مقدم کیا گیا۔

☆ حدیث پاک میں لسان کا تذکرہ کیوں کیا؟ جبکہ زبان سے تو ایذا نہیں پہنچ سکتی ، زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سے ،قول سے ، کلام سے ایذا پہنچتی ہے .....نہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کئی مرتبہ دوسرے کا دل جلانے کے لیے زبان کو نکال کر اشارہ کر دیتے ہیں ۔منہ سے زبان نکال کر دوسرے کا منہ چڑا دیتے ہیں ۔کوئی لفظ نہیں بولتے ۔معلوم ہوا کہ زبان کی ایذا فقط بولنے تک ہی نہیں ۔زبان نکالنے سے بھی ایذا پہنچائی جا سکتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اللہ کے محبوب ﷺ نے زبان کے کلام کی بات نہیں فرمائی ۔فقط من لسانہ کا تذکرہ فرما دیا۔

☆ حدیث پاک میں ہاتھوں کا تذکرہ کیا ، پاؤں کا تذکرہ نہیں کیا ، کیوں ؟ اس لیے کہ ہاتھ عام طور پر

پورے جسم کے نمائندے ہوتے ہیں۔اسی لیے تو لوگ کہتے ہیں: ''اس کے بڑے لمبے ہاتھ ہیں'' کہتے ہیں: ''اس میں کسی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔'' لگتا ہے کہ اس میں ہمارے کسی مخالف کا ہاتھ ہے۔'' گویا جب کسی کی فخر اندازی کا تذکرہ کرنا ہو تو اس کے ہاتھوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔لوگ کہتے ہیں: '' آؤ جی! میرے ہاتھ مضبوط کرو۔'' ان تمام باتوں میں ہاتھ پورے جسم کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔اس لیے پاؤں کا تذکرہ نہیں کیا، ان تمام باتوں میں ہاتھ پورے جسم کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔اس لیے پاؤں کا تذکرہ نہیں کیا، فقط ہاتھوں کا تذکرہ کیا ہے۔

بھئی! مومن، شر کو پسند کرنا تو کیا شر پر راضی بھی نہیں ہوا کرتا، یعنی مومن شر پر نہیں ہوتا بلکہ وہ مسلمان ہوتا ہے۔وہ دوسروں کے لیے راحت جان بنتا ہے۔

گھر والوں کے لیے راحتِ جان

پڑوسیوں کے لیے راحتِ جان

بچوں کے لیے راحتِ جان

بڑوں کے لیے راحتِ جان

اپنوں کے لیے راحتِ جان

پرایوں کے لیے راحتِ جان

دوستوں کے لیے راحتِ جان، حتیٰ کہ

دشمنوں کے لیے بھی راحتِ جان بن کر رہتا ہے۔اس کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ میری ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ہاں! کئی مرتبہ ایسا ہوسکتا ہے کہ میل جول والے دوست زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ ایسا معاملہ رکھ نہیں پاتا، تو اسے مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔ورنہ دل سے پوچھو تو:

ہر ایک کا احترام دل میں

ہر ایک کی محبّت دل میں

ہر ایک کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا

اس کا ہر ایک کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ایسے بندے کو مومن کہتے ہیں ایسے بندے کو مسلمان کہتے ہیں۔میرے دوستو! ہم اپنے دلوں میں جھانک کے دیکھیں کہ ہم نے اللہ کی مخلوق کو کتنا ستایا ہوا ہے۔

اس حدیث مبارکہ کا مفہوم یہ بنا کہ

''مسلمان وہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کو ایذا دینے والے اعمال ترک کردے۔''

یہ اس حدیث کا لب لباب ہے۔صحابہ کرام اس کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔

مسلمان بھائی کی عزتِ نفس کا خیال:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود ہیں۔نماز کا وقت قریب ہے۔محفل میں کچھ بدبو سی محسوس ہوئی۔اس سے پتہ چلا کہ کسی کا وضو ٹوٹ گیا ہے۔اب صاف ظاہر ہے کہ جس کا وضو ٹوٹا اگر وہ اٹھ کر جاتا تو لوگوں کے سامنے اس کو شرمندگی ہوتی۔وہ آپس میں اتنے شیر وشکر تھے، اتنا پیار تھا، اتنی محبّت تھی کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے ہیں، نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے پوچھتے ہیں: اے اللہ کے نبی! کیا ہمیں اجازت ہے کہ ہم سب جائیں اور دوبارہ وضو کر کے آئیں۔نبی علیہ السّلام نے فرمایا: ہاں۔چنانچہ جتنے لوگ بیٹھے تھے سب نے جا کر نیا وضو کیا تا کہ یہ نہ پتہ چلے کہ کس کا وضو ٹوٹا تھا اور اسے شرمندگی نہ اٹھانی پڑ جائے۔یہ ہوتا ہے مسلمان، جو اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو مجھ سے راحت ملے۔راحت جان بن کر رہتا ہے وبال جان بن کر نہیں رہتا۔

خانقاہیں، تربیت گاہیں:

یہ باتیں سیکھنے کے لیے انسان کو خانقاہوں میں آنا پڑتا ہے کیونکہ یہ ایسی باتیں ہیں جو ماں باپ گھروں میں نہیں سکھا پاتے۔ کیونکہ بچے سے ماں باپ کو لاڈ پیار کا تعلّق بھی ہوتا ہے۔ اور وہ اس لیے بھی اسے نہیں سکھا پاتے کہ اگر وہ بیٹے کی ایک بات پر ٹوکیں گے تو بیٹا آگے سے باپ کی دو باتیں دکھا دے گا۔ یہی تو آجکل مدارس میں مصیبت بنی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ عاجز نے مدرسے کے ایک استاد صاحب سے پوچھا: جی! آپ جب طلبا کو پڑھاتے ہیں تو ان کو ساتھ ساتھ آپ سمجھاتے کیوں نہیں؟ تربیت کیوں نہیں کرتے۔ کہنے لگے: جی! یہ کام تو آپ لوگ کریں۔ پوچھا: وہ کیوں؟ کہنے لگے: جی! طلبا بڑے ہوتے ہیں، سمجھدار ہوتے ہیں، اگر ہم ان کی ایک بات کو ٹوکیں گے تو وہ ہماری دس باتوں کو ٹوک دیں گے، اس لیے ہم یہ کھاتہ کھولتے ہی نہیں۔ پھر کہنے لگے: جی! آپ لوگ چونکہ اسی کام میں لگے ہوتے ہیں، یہ تعلّق بھی عقیدت کا ہوتا ہے، آپ ڈانٹ بھی دیں گے تو وہ سن لیں گے اور اگر آپ سمجھائیں گے تو وہ مان بھی لیں گے، اس لیے یہ کام آپ ہی کریں، یہ کام ہم سے نہیں ہوسکتا..... واقعی! ان کی بات سمجھ میں آئی کہ مجبوریاں بھی ہیں۔ تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ایک عقیدت اور محبّت کا تعلّق دیا ہوتا ہے اس لیے کسی کو نرمی سے سمجھا دیا جاتا ہے تو کسی کو ذرا گرمی سے سمجھا دیا جاتا ہے۔ نرمی اور گرمی دونوں کا مقصد سمجھانا ہوتا ہے۔ دل میں کسی کے بارے میں کینہ نہیں ہوتا۔

جو بندہ اس حقیقت کو سمجھ گیا اس کی اصلاح کا راستہ آسان ہوگیا۔ چنانچہ اگر آپ سے کوئی آج کا سبق پوچھے تو آپ بتا سکتے ہیں کہ آج کا سبق ہمیں یہ ملا ہے کہ ہم مسلمان تب بنیں گے جب مسلمانوں کو ایذا دینے والے اعمال چھوڑ دیں گے..... اچھا! اگر گھر جا کر بیوی نے پوچھا کہ پیر صاحب نے کیا سکھایا، تو کیا آپ وہاں بھی یہ بتائیں گے؟ مصیبت بن جائے گی۔ جب بیوی کو پتہ چل جائے گا کہ پیر صاحب

نے کیا سکھایا ہے تو وہ تو شیرنی بن جائے گی .....تو انسان حقیقی معنوں میں تبھی مسلمان بن سکتا ہے جب کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو ایذا پہنچانے والے اعمال ترک کر دے۔بس آج آپ نے اس نکتے پہ سوچنا ہے، رات میں جب تک سو نہیں جاتے ، یا کل صبح تک جب تک آپ اگلے درس میں آنہیں جاتے ۔اس چیز کو ہر بندہ سوچے کہ میں کہاں کہاں اور کس کس کے دل کو ایذا پہنچاتا ہوں ۔اگر اس پر آج رات آپ نے سوچ لیا اور جس جس انسان کو آپ نے ایذا پہنچائی اللہ تعالیٰ سے بھی معافی مانگیں گے اور اس بندے سے بھی معافی مانگ لیں گے ۔تو بس سمجھیے کہ نسبت کا نور ملنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دروازے کو کھول دیا۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دوسروں کے لیے راحت جان بن کر رہنے کی توفیق عطا فرمائیں ۔(آمین ثم آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ